بیضاء پر ایک عمرانی نظر

از

ترجمان حقیقت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال

ترجمہ

مولانا ظفر علی خاں

اقبال اکیڈمی لاہور

سلسلہ مطبوعات اقبال اکیڈیمی

ہمارے ہندستانی مسلمان
سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہید کی تحریک مجاہدین کے
بالکل صحیح اور سبق آموز حالات۔ انگریزی سے اردو ترجمہ
از
ڈاکٹر ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر ایل ایل ڈی آئی سی ایس بنگال — عـہ ۱۲/

المنبہات
عربی کی مشہور کتاب جو نصائح و حکم کا ایک نادر مجموعہ
ہے اور عربی پڑھنے والے بچوں کیلئے بالخصوص طبع کی گئی ہے
شیخ ابن الحجر عسقلانی شارح بخاری شریف — عہ/

سیرت سیدہ فاطمہؓ۔ (مستورات کے لئے) — ۱۲/

دربارِ رسولؐ کے فیصلے (برکاتِ نبوی کا ذخیرہ) — ۸/

کتبِ سماوی پر ایک نظر (تورات و انجیل پر ایک پُر مغز تبصرہ) — ۱۲/

شفاء العلیل (اردو ترجمہ القول الجمیل) شاہ ولی اللہ دہلویؒ — ۸/

مولانا ابو الکلام آزاد (تنقید و تبصرہ کی نگاہ میں) — ۸/

کالا پانی
مولانا محمد جعفر تھانیسری کی جلاوطنی
اور قید و بند کی دلچسپ روداد — عہ/

تذکیر الاخوان (از مولانا شاہ اسماعیل شہید دہلوی) — ۸/

عہد نبویؐ کے میدانِ جنگ (از ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب) — ۸/

بکھرے موتی (نہایت پاکیزہ ادبی افسانے) — ۸/

القول الجمیل (عربی) حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی۔ — عہ/

تقویۃ الایمان (اردو) حضرت شاہ اسماعیل شہید۔ — ۸/

جعفر منصور (خلیفہ جعفر منصور عباسی کے حالات) ابو القاسم فتوی دہلوی۔ — عہ/

مِلّتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر

از

حکیمِ مِلّت ترجمانِ حقیقت علّامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال رحمہ اللہ تعالیٰ

مترجمہ

مولانا ظفر علی خاں

اقبال اکیڈیمی ایبک روڈ۔ انار کلی لاہور

قیمت ۶ر

زیرِ نظر رسالہ۔ ایک لیکچر تھا جو حکیم الامّت ڈاکٹر سر محمد اقبال علیہ الرحمۃ نے سنہ ۱۹۱۰ء کے آغاز میں اسٹریچی ہال ایم اے او کالج علیگڑھ میں دیا تھا۔ مضمون کا اندازہ خود نام سے ہو سکتا ہے۔ علامہ مرحوم ادب و فلسفہ کے علاوہ عمرانیات کے نہایت بالغ نظر، عالم اور ماہر تھے۔ قوموں کے عروج و زوال کے اسباب و علل پر ان کی گہری نظر تھی۔ اس مضمون میں اسلام پر تجلیسی و معاشی نقطۂ نظر سے بحث کی گئی ہے جس سے پتہ چلتا ہے۔ کہ حضرت علامہ نے حکمت ایمانی اور مصلحت عمرانی کا مطالعہ ایک دوسرے سے تعلق کی روشنی میں خوب دقّتِ نظر سے کیا ہے۔

اصل انگریزی زبان میں تھا حضرت مولینا ظفر علی خاں نے اس کو اردو میں ترجمہ کیا۔ اور مئی سنہ ۱۹۱۱ء میں اسلامیہ ہال لاہور میں یہ ترجمہ ایک عام جلسے میں پڑھ کر سنایا۔ یہ جلسہ محض اسی لیکچر کو سنانے کے لئے منعقد کیا گیا تھا۔ علامہ اقبال بھی اس جلسہ میں شریک تھے۔ بعد میں یہ ترجمہ مذکورہ بالا نام سے کتابی شکل میں شائع ہوا۔ لیکن آجکل نایاب ہے اور تقریباً مومن کی گمشدہ پونجی بن چکا ہے۔

محمد شاہ

ملّتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر

انسانی تاریخ کے پارینہ اوراق کو لوٹتے وقت جب ہماری نظر ارتقاء کی الم ریز جھلملیوں میں سے چھنتی ہوئی ان کے رزمیہ بین السطور پر پڑتی ہے تو کسی خواب کے گریزپا نظّارہ کی طرح ہم گزری ہوئی قوموں، سلطنتوں اور تمدنوں کے کھنڈروں کو پے بہ پے نیست سے ہست اور ہست سے نیست ہوتے دیکھتے ہیں جس سے زیادہ ہیبت افزا اور حوصلہ فرسا منظر اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ قدرت کی قوتوں کی نظروں میں نہ افراد کی وقعت ہے نہ اقوام کی منزلت۔ اس کے اٹل قوانین برابر اپنا عمل کئے جا رہے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اس کی منزلِ مقصود بہت ہی دُور ہے۔ جسے مقاصدِ انسانی کے آغاز و انجام سے کسی قسم کا تعلق نہیں لیکن ؎ آدمی زادہ طرفہ معجونیست

باوجود حالاتِ گرد و پیش کی نامساعدت کے اس کی تخیل جو عقل کی آئینہ بردار ہے اسے اپنی ہستی کا کامل تر جلوہ دکھا دیتی ہے اور ان ذرائع کی دریافت پر آمادہ کرتی ہے جو اس تصویرِ مثالی میں جس کے خط و خال اس کی شانِ انکلیت کو چھپائے ہوتے ہیں جان ڈال سکیں۔ دوسرے حیوانات کے مقابلہ میں انسان بہت ہی کمزور و ناتواں ہے۔ اپنے بچاؤ کے لئے وہ قدرتی حربوں سے مسلح

نہیں کیا گیا۔ وہ بصارت شبینہ سے محروم ہے۔ اس کی قوت شامہ اور طاقت گریز بہت کم ہے لیکن پھر بھی زندگانی کی آزادیوں اور پنہائیوں کی جستجو میں اس نے اپنی انتھک سرگرمیوں کو ہمیشہ کے لئے وقف کر رکھا ہے تاکہ قوانین قدرت کی کنہ اور طرزِ عمل سے واقف ہو کر وہ رفتہ رفتہ ان اسباب پر حاوی ہو جائے جو خود اس کے ارتقاء پر مؤثر ہیں۔

قانون انتخاب فطری کے اکتشاف عظیم کی بدولت انسان اپنے خانوادہ کی تاریخ کا عقلی تصور قائم کرنے کے قابل ہو گیا حالانکہ پہلے اس تاریخ کے واقعات کی حیثیت اس کے نزدیک حوادث کے ایک فوق الادراک سلسلہ سے زیادہ نہ تھی۔ جو بلا کسی اندرونی ترتیب یا غائیت کے فرداً فرداً مادر ایام کے سراپا اسرار باطن سے پیدا ہو کر گہوارۂ شہود میں اٹکھیلیاں کرتے ہوئے نظر آیا کرتے تھے۔ اس قانون کے معانی کی تنقید جب اور بھی زیادہ دقت نظر کے ساتھ کی گئی اور ان فلاسفہ نے جن کی خیال آفرینیاں ڈارون کے مقدمہ حکمت کا تتمہ ہیں جب حیات کی ہیئت اجتماعی کے دوسرے نمایاں حقائق کا اکتشاف کیا تو مدنی زندگی کے عمرانی، اخلاقی، اقتصادی اور سیاسی پہلوؤں کے متعلق انسان کے تصورات میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہونے کی صورت نکل آئی۔

علم الحیات کے اصولوں نے حال میں حقیقت پر روشنی ڈالی ہے کہ فرد فی نفسہٖ ایک ہستی اعتباری ہے۔ یا یوں کہیئے کہ اس کا نام ان مجردات عقلیہ کی قبیل سے

ہے جن کا حوالہ دے کر عمرانیات کے مباحث کے سمجھنے میں آسانی پیدا کر دی جاتی ہے۔ بالفاظ دیگر فرد اس جماعت کی زندگی میں جس کے ساتھ اس کا تعلق ہے بمنزلہ ایک عارضی و آنی لمحہ کے ہے۔ اس کے خیالات اُس کی تمنائیں۔ اس کا طرزِ ماندوبود اس کے جملہ قوائے دماغی و جسمانی بلکہ اس کے ایام زندگی کی تعداد تک اُس جماعت کی ضروریات و حوائج کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے جس کی حیات اجتماعی کا وہ محض ایک جزوی مظہر ہے۔ فرد کے افعال کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ وُہ بر سبیل اضطرار و بلا ارادہ کسی ایک خاص کام کو جو جماعت کے نظام نے اس کے سپرد کیا ہے انجام دے دیتا ہے اور اس لحاظ سے اس کے مقاصد کو جماعت کے مقاصد سے تخالف کلی بلکہ تضادِ مطلق ہے۔ جماعت کی زندگی بالحاظ اپنے اجزائے ترکیبی یعنی افراد کی زندگی کے بالکل جُداگانہ ہوتی ہے اور جس طرح ایک جسم ذوی الاعضا مریض ہونے کی حالت میں بعض دفعہ خود بخود بلا علم و ارادہ اپنے اندر ایسی قوتوں کو برانگیختہ کر دیتا ہے جو اس کی تندرستی کا موجب بن جاتی ہے۔ اسی طرح ایک قوم جو مخالف قوتوں کے اثرات سے سقیم الحال ہو گئی ہو بعض دفعہ خود بخود ردِّ عمل کرنے والی قوتوں کو پیدا کر لیا کرتی ہے مثلاً قوم میں کوئی زبردست دل و دماغ کا انسان پیدا ہو جاتا ہے یا کوئی نئی تجسیم نمودار ہوتی ہے یا ایک ہمہ گیر مذہبی اصلاح کی تحریک بروئے کار آتی ہے جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ قوم کے قوائے ذہنی و روحانی باغی اور سرکش قوتوں کو اپنا مطیع و منقاد بنانے اور اس مواد

فاسد کو خارج کر دینے سے جو قوم کے نظام جسمانی کی صحت کے لئے مضر تھا قوم کو نئے سرے سے زندہ کر دیتے ہیں اور اس کی اصلی توانائی اس کے اعضا میں عود کر آتی ہے۔ اگرچہ قوم کی ذہنی و دماغی قابلیت کا دھارا افراد ہی کے دماغ میں سے ہو کر بہتا ہے لیکن پھر بھی قوم کا اجتماعی نفس ناطقہ جو مدرکِ کلیات و جزئیات اور خبیر و مرید ہے بجائے خود ضرور موجود ہوتا ہے "جمہوری رائے اور قومی فطنت" وہ جملے ہیں جن کی وساطت سے ہم موہوم و مبہم طور پر اس نہایت ہی اہم حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ قومی ہستی ذوی العقل اور ذوی الارادہ ہے۔ اڑدہام خلائق جلسۂ عام۔ جماعت انتظامی۔ فرقہ مذہبی اور مجلس مشاورت وہ مختلف ذرائع ہیں جن سے قوم اپنی تدوین و تنظیم کا کام لے کر وحدت ادراک کی غائت کو حاصل کرتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ قومی دماغ تمام ان مختلف خیالات کی خبر یا علم رکھتا ہو جو ایک وقت خاص میں افراد کے دماغوں میں مصروف ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ خود افراد کا دماغ بھی کامل طور پر اپنی ادراکی حالتوں سے آگاہ نہیں ہوتا۔ اجتماعی یعنی قومی دماغ میں بہت سے احساسات و مقامات و تخیلات قومی حاسہ کی دہلیز سے باہر رہتے ہیں۔ قوم کی ہمہ گیر دماغی زندگی کا فقط ایک جزو محدود دروازہ کے اندر قدم رکھتا ہے۔ اور قومی ادراک کی تابناک شعاعوں سے منور ہوتا ہے۔ اس انتظام کی بدولت مرکزی اعضا کی توانائی کی ایک بہت بڑی مقدار غیر ضروری جزئیات پر صرف ہونے سے محفوظ رہتی ہے

جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ قوم ایک جداگانہ زندگی رکھتی ہے۔ یہ خیال کہ اس کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ یہ اپنے موجودہ افراد کا محض ایک مجموعہ ہے اصولاً غلط ہے اور اسی لئے تمدنی و سیاسی اصلاح کی تمام وہ تجاویز جو اس مفروضہ پر مبنی ہوں بہت احتیاط کے ساتھ نظر ثانی کی محتاج ہیں۔ قوم اپنے موجودہ افراد کا مجموعہ ہی نہیں ہے بلکہ اس سے بہت کچھ بڑھ چڑھ کر ہے۔ اس کی ماہیت پر اگر نظر غائر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ غیر محدود و لامتناہی ہے۔ اس لئے کہ اس کے اجزائے ترکیبی میں وہ کثیر التعداد آنے والی نسلیں بھی شامل ہیں جو اگرچہ عمرانی حد نظر کے فوری منتہا کے پرلی طرف واقع ہیں لیکن ایک زندہ جماعت کا سب سے زیادہ اہم جزو تصور ہونے کے قابل ہیں۔ علم الحیات کے اکتشافات جدیدہ نے اس حقیقت کے چہرہ پر سے پردہ اٹھایا ہے کہ کامیاب حیوانی جماعتوں کا حال ہمیشہ استقبال کے تابع ہوتا ہے۔ مجموعی حیثیت سے اگر نوع پر نظر ڈالی جائے تو اس کے وہ افراد جو ابھی پیدا نہیں ہوئے اس کے موجودہ افراد کے مقابلہ میں شائد زیادہ بدیہی الوجود ہیں۔ موجودہ افراد کی فوری اغراض ان غیر محدود و نامشہود افراد کی اغراض کے تابع بلکہ ان پر نثار کر دی جاتی ہیں جو نسلاً بعد نسلٍ بتدریج ظاہر ہوتے رہتے ہیں اور علم الحیات کی اس حیرت انگیز حقیقت کو وہ شخص بہ نگاہ استغنا نہیں دیکھ سکتا جس کے پیش نظر سیاسی یا تمدنی اصلاح

ہے۔ میں اپنی قوم کی موجودہ عمرانی حرکت پر اسی پہلو سے نظر ڈالنا چاہتا ہوں۔
اگر غور سے دیکھا جائے تو اقوام کے لئے سب سے زیادہ مہتمم بالشان عقدہ
فقط یہ عقدہ ہے (خواہ اس کی نوعیت تمدنی قرار دی جائے خواہ اقتصادی
خواہ سیاسی) کہ قومی ہستی کا سلسلہ بلا انقطاع کس طرح قائم رکھا جائے
مٹنے یا معدوم ہونے کے خیال سے قومیں اُسی طرح خائف ہیں جیسے
افراد۔ کسی قوم کی مختلف عقلی یا غیر عقلی قابلیتوں اور استعدادوں کے
محاسن کا اندازہ اسی غایت الغایات سے کرنا چاہیئے۔ ہم کو لازم ہے
کہ اپنے محاسن کو جانچیں اور پرکھیں۔ اور اگر ضرورت آپڑے تو نئے محاسن
پیدا کریں۔ اس لئے کہ بقول نیٹشا کے کسی قوم کی بقا کا دارومدار محاسن
کی مسلسل و غیر مختتم تولید پر ہوتا ہے۔ کائنات یقیناً جناب باری کی حکمت
بالغہ کے سانچے میں ڈھلی ہوئی معلوم ہوتی ہے مگر اس کا مفہوم تاہنوز
انسانی ہے۔ لیکن اس تبصرہ کے آغاز سے پہلے ہی چند تمہیدی امور پر
بحث کرنا چاہتا ہوں۔ اس لئے کہ یہ بحث میرے نزدیک جماعت مسلمین
کے متعلق کسی نتیجہ پر پہنچنے کے لئے ضروری ہے۔ یہ اُمور جن پر میں ترتیب وار
نظر ڈالوں گا حسب ذیل ہیں :-

۱۔ جماعت المسلمین کی ہیئت ترکیبی۔

۲۔ اسلامی تمدن کی یک رنگی۔

۳۔ اس سیرت کا نمونہ جو مسلمانوں کی قومی زندگی کے تسلسل کے لئے لازمی ہے

اوّلاً مسلمانوں اور دنیا کی دوسری قوموں میں اصولی فرق یہ ہے کہ قومیّت کا اسلامی تصور دوسری اقوام کے تصوّر سے بالکل مختلف ہے۔ ہماری قومیّت کا اصل اصول نہ اشتراکِ زبان ہے۔ نہ اشتراکِ وطن۔ نہ اشتراکِ اغراض اقتصادی۔ بلکہ ہم لوگ اس برادری میں جو جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم ۔۔۔ فرمائی تھی اس لئے شریک ہیں کہ مظاہرِ کائنات کے متعلق ہم سب کے معتقدات کا سرچشمہ ایک ہے۔ اور جو تاریخی روایات ہم سب کو ترکہ میں پہنچی ہیں وہ بھی ہم سب کے لئے یکساں ہیں۔ اسلام تمام مادی قیود سے بیزاری ظاہر کرتا ہے اور اس کی قومیت کا دارومدار ایک خاص تنزیہی تصوّر پر ہے جس کی تجسیمی شکل وہ جماعت اشخاص ہے جس میں بڑھنے اور پھیلتے رہنے کی قابلیت طبعاً موجود ہے۔ اسلام کی زندگی کا انحصار کسی خاص قوم کے خصائل مخصوصہ اور شمائل مختصہ پر نہیں ہے۔ عربی اسلام زمان و مکان کی قیود سے مبرّا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قوم عرب نے جس کے بطن سے اسلام پیدا ہوا اس کی پولٹیکل نشوونما میں بہت بڑا حصّہ لیا لیکن اسلامی علوم وفنون اور فلسفہ وحکمت کے انمول موتیوں کے رولنے کا کام اور یہ وہ کام ہے جو نفس ناطقہ انسانی کی اعلیٰ زندگی کے کارناموں سے متعلق ہے زیادہ تر غیر عرب اقوام ہی نے انجام دیا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اسلام کا ظہور قوم عرب

کی زندگی کی تاریخ میں یزدان طلبی کی ایک آنی و عارضی جھلک ہونے کے لحاظ سے گویا برق کی چشمک تھی۔ یا شرار کا تبسّم تھا لیکن اسلام کی دماغی توانائیوں کا جولانگاہ عرب نہ تھا بلکہ عجم تھا پس چونکہ اسلام کا جوہر ذاتی بلا کسی آمیزش کے خالص طور پر ذہنی یا تخیلی ہے لہذا کیونکر ممکن تھا کہ وہ قومیّت کو کسی خارجی یا حسّی اصول مثلاً وطن پر مبنی قرار دینا جائز تصور کرے قومیّت کا ملکی تصوّر جس پر زمانۂ حال میں بہت کچھ حاشیے چڑھائے گئے ہیں اپنی آستین میں اپنی تباہی کے جراثیم کو خود پرورش کر رہا ہے اور اس میں شک نہیں کہ قومیّت کے جدید تصوّر نے چھوٹے چھوٹے پولیٹکل حلقے قائم کر کے اور ان میں رقابت کے اس صحیح القوام عنصر کو پھیلا کر (جس تمدّن جدیدہ کی شاخ میں بوقلمونی کا پیوند لگایا ہے) دنیا کو تھوڑا بہت فائدہ ضرور پہنچایا ہے لیکن بڑی خرابی اس تصوّر میں یہ ہے کہ اس میں غلو اور افراط کا شاخسانہ نکل آتا ہے۔ اس نے بین الاقوامی نیتوں کی نسبت غلط فہمی پھیلا رکھی ہے۔ اس نے پولیٹیکل سازشوں اور منصوبہ بازی کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ اس نے فنون لطیفہ و علوم ادبیّہ کو خاص خاص قوموں کی خصوصیات کی میراث قرار دے کر عام انسانی عنصر کو اس میں سے نکال دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وطن پرستی کا خیال جو قومیّت کے تصوّر سے پیدا ہوتا ہے ایک طرح سے مادی شے کا تالیہ ہے جو سراسر اصول اسلام

کے خلاف ہے۔ اس لئے کہ اسلام دنیا میں ہر طرح کے شرک خفی و جلی کا قلع قمع کرنے کے لئے نمودار ہوا تھا لیکن اس سے یہ گمان نہ کیا جائے کہ میں جذبۂ حبِّ وطن کا سرے سے مخالف ہوں۔ ان قوموں کے لئے جن کا اتحاد حدود ارضی پر مبنی ہو اس جذبہ سے متاثر ہونا ہر طرح سے حق بجانب ہے لیکن میں ان لوگوں کے طرزِ عمل کا یقیناً مخالف ہوں جو اس امر کے معترف ہونے کے باوجود کہ جذبہ حب وطن قومی سیرت کا ایک قیمتی عنصر ہے ہم مسلمانوں کی عصبیت کو نام دھرتے ہیں اور اسے وحشیانہ تعصب کہہ کر پکارتے ہیں۔ حالانکہ ہماری عصبیت سے بجز اس کے اور کچھ مراد نہیں کہ اصول حب نفس بجائے اس کے کہ ایک فرد واحد میں ساری و دائر ہو ایک جماعت پر اپنا عمل کرتا ہے۔ حیوانات کی تمام نوعیں کم و بیش ضرور متعصب ہوتی ہیں اور اگر انہیں اپنی انفرادی یا اجتماعی ہستی برقرار رکھنی ہے تو ضرور ہے بلکہ لازمی ہے کہ ان میں عصبیت موجود ہو۔ اقوام عالم پر نظر ڈالئے۔ ایک قوم بھی ایسی نہ ہوگی جو پیرایۂ عصبیت سے عاری ہو۔ کسی فرانسیسی کے مذہب پر نکتہ چینی کیجئے وہ بہت ہی کم متاثر ہوگا اس لئے کہ آپ کی نکتہ چینی نے اس اصول کو مس نہیں کیا جو اس کی قومیت کی رُوح رواں ہے لیکن ذرا اس کے تمدن اس

کے ملک یا پولیٹیکل سرگرمیوں کے کسی شعبہ کے متعلق اس کی قوم کے مجموعی طرزِ عمل یا شعار پر تو خردہ گیری کر دیکھئے - پھر اس کی جبلّی عصبیّت کا شعلہ بھڑک نہ اٹھے تو ہم جانیں بات یہ ہے کہ فرانسیسی کی قومیّت کا انحصار اس کے معتقدات مذہبی پر نہیں ہے بلکہ جغرافی حدود یعنی اس کے ملک پر ہے۔ پس جب آپ اس خاص خطۂ زمین پر جسے اس نے اپنے تخیّل میں اپنی قومیت کا اصلی اصول قرار دے رکھّا ہے معترض ہوتے ہیں تو آپ اس کی عصبیّت کو واجبی طور پر برانگیختہ کرتے ہیں - لیکن ہماری حالت اس سے بالکل مختلف ہے۔ ہماری قومیت ایک شے معہود فی الذہن ہے۔ موجود فی الخارج نہیں ہے بلحاظ ایک قوم ہونے کے ہم جس مرکز پر آ کر جمع ہو سکتے ہیں وہ مظاہر آفرینش کے متعلق ایک خاص قسم کا اشتراکی سمجھوتہ ہے جو ہم نے آپس میں کر رکھّا ہے۔ پس اگر کسی کا ہمارے مذہب کو برا کہنا ہماری آتش عصبیّت کو برافروختہ کرتا ہے میری دانست میں یہ برفروختگی اس فرانسیسی کے غصّہ سے کچھ کم نہیں ہے جو اپنے وطن کی برائیاں سن کر بھڑک اٹھتا ہے۔ عصبیّت سے صرف قومی پاسداری مراد ہے۔ دوسری اقوام کو نگاہِ تنفّر دیکھنا اس کے مفہوم میں داخل نہیں ہے۔ بزمانہ قیام انگلستان

جب کبھی مجھے کسی خاص مشرقی رسم یا طرزِ خیال کو کسی انگلش لیڈی یا جنٹلمین کے سامنے بیان کرنے کا اتفاق ہوا تو مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اس پر اظہارِ تعجب نہ کیا گیا ہو جس سے مجھے رہ رہ کر یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ ان لوگوں کے نزدیک ہر غیر انگلش خیال گویا عجائباتِ قدرت ہے۔ مجھے انگریزی قوم کا یہ وطیرہ نہایت ہی پسند ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ قوم پیرایۂ تخیّل سے عاری ہے۔ جس خاک سے شیکسپیئر۔ شیلے۔ کیٹس۔ ٹینی سن اور سوبرن پیدا ہوئے ہوں وہ بھلا خیال آفرینیوں اور ذہانت آرائیوں سے کیوں معرّا ہو سکتی ہے۔ البتّہ یہ بات ہمیں ماننی پڑتی ہے کہ انگلستان کا طریقۂ ماند بود اور طرزِ غور و فکر وہاں کے آئین و قوانین اور اس کے رسم و رواج اس ملک کے رہنے والوں کی زندگی کے اجزائے لاینفک بن گئے ہیں۔

غرض مذہبی خیال بلا اس دینی اکتناز کے جو افراد کی آزادی میں ضروری طور پر خلل انداز ہو اسلامی جماعت کی ہیئت ترکیبی کا مدار علیہ ہے۔ آگسٹس کا قول ہے کہ "چونکہ مذہب ہماری کل ہستی پر حاوی ہے لہٰذا اس کی تاریخ ہماری نشو و نما کی پوری تاریخ کا خلاصہ ہونی چاہیئے۔" یہ قول جیسا ہماری قوم پر صادق آتا ہے۔

ویسا کسی اور قوم پر نہیں آتا لیکن یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر اسلامی جماعت کی ہیئت ترکیبی کا انتہائی مدار علیہ محض وہ چند معتقدات ہیں جن کی نوعیت مابعد الطبعی ہے تو کیا یہ بنیاد نہایت ہی متزلزل نہیں ہے؟ خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ علوم جدیدہ تیز یا ترقی کر رہے ہیں اور ہر بات کے حسن و قبح کو پرکھنا اور معقولات اور منطقی استدلال سے قدم قدم پر کام لینا ان علوم کا لازمہ قرار دیا گیا ہے۔ مشہور فرانسیسی مستشرق رینان کا یہی خیال تھا اور دبے الفاظ میں اس نے یہ امید ظاہر کی تھی کہ اسلام ایک دن دنیا کے بڑے حصے کی عقلی و اخلاقی پیشوائی کے منصب اعلیٰ سے گر جائے گا۔ جن اقوام کی اجتماعی زندگی کا اصل اصول حدود ارضی سے وابستہ ہو انہیں معقولات سے خائف نہ ہونا چاہیئے لیکن ہمارے حق میں یہ ایک خطرناک دشمن ہے اس لئے کہ یہ اسی اصول کو مٹانا چاہتا ہے جس پر ہماری قومی ہستی مبنی ہے اور جس نے ہمارے اجتماعی وجود کو قابل فہم بنا رکھا ہے۔ تعقل، دراصل تجزیہ ہے اور اسی لئے معقولات سے اس قومی شیرازہ کے بکھر جانے کا اندیشہ ہے جو مذہبی قوت کا باندھا ہوا ہے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ ہم معقولات کا توڑ عقلی حربوں سے

کر سکتے ہیں۔ لیکن میں جس بات پر زور دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے
کہ اعتقاد یعنی ہمہ گیر وفاق کا وہ نکتہ جس پر ہماری جماعت کی وحدت
منحصر ہے ہمارے لئے اپنے مفہوم کے لحاظ سے عقلی نہیں بلکہ
قومی ہے۔ مذہب کو فلسفہ نظری بنانے کی کوشش کرنا میری
رائے میں بے سود محض بلکہ لغو و مہمل ہے۔ اس لئے کہ مذہب کا مقصد
یہ نہیں ہے کہ انسان بیٹھا ہوا زندگی کی حقیقت پر غور کیا کرے
بلکہ اس کی اصلی غائت یہ ہے کہ زندگی کی سطح کو بتدریج بلند
کرنے کے لئے ایک مربوط و متناسب عمرانی نظام قائم کیا
جائے۔ مذہب سیرت انسانی کا ایک نیا اسلوب یا نمونہ پیدا کر
کے اس شخص کے اثر کے لحاظ سے جو اس سیرت کا مظہر ہے
اس نمونہ کو دنیا میں پھیلانا چاہتا ہے اور اس طور پر چونکہ وہ ایک
نئی دنیا کو نیست سے ہست کرتا ہے لہٰذا اس پر مابعد الطبعیات
کا اطلاق ہوتا ہے۔ میری مراد ان تمام باتوں سے جو اوپر بیان کی
گئی ہیں یہ ہے کہ اسلام کی حقیقت ہمارے لئے یہی نہیں کہ
وہ ایک مذہب ہے بلکہ اس سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ اسلام میں
قومیت کا مفہوم خصوصیات کے ساتھ چھپا ہوا ہے اور ہماری
قومی زندگی کا تصور اس وقت تک ہمارے ذہن میں نہیں آسکتا

جب تک کہ ہم اصولِ اسلام سے پوری طرح باخبر نہ ہوں۔ بالفاظ دیگر اسلامی تصور ہمارا وہ ابدی گھر یا وطن ہے جس میں ہم اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ جو نسبت انگلستان کو انگریزوں اور جرمنی کو جرمنوں سے ہے وہ اسلام کو ہم مسلمانوں سے ہے۔ جہاں اسلامی اصول یا ہماری مقدس روایات کی اصطلاح میں خدا کی رسّی ہمارے ہاتھ سے چھوٹی اور ہمارا شیرازہ بکھرا۔

ثانیاً:۔

معتقدات مذہبی کی وحدت جس پر ہماری قومی زندگی کا دارومدار ہے اگر مضاف سے تعبیر کی جائے تو اسلامی تہذیب کی یکرنگی بمنزلہ اس کے مضاف الیہ کے ہیں محض اسلام پر ایمان لے آنا، اگرچہ نہایت ہی ضروری ہے لیکن کافی و مکتفی نہیں ہے۔ قومی ہستی میں شریک ہونے کی غرض ہے ہر فرد کے لئے قلب ماہیت لازمی ہے اور اس قلب ماہیت کے لئے خارجی طور پر تو ارکان و قوانین اسلام کی پابندی کرنی چاہیئے اور اندرونی طور پر اس ایک رنگ تہذیب و شائستگی سے استفادہ کرنا چاہیئے جو ہمارے آباؤ اجداد کی متفقہ عقلی تحریک کا ماحصل ہے۔ اسلامی جماعت کی تاریخ پر جس قدر زیادہ غور کیا جائے گا اسی قدر یہ تاریخ حیرت انگیز د

معراج پر پہنچ چکا ہے محبت کا دوسرا نام تقلید ہے لیکن یہاں عشق اور تقلید کے یہ معنی نہیں ہیں کہ عاشق اپنے آپ کو معشوق کی ذات میں یا مقلد اپنے آپ کو مرشد کی ذات میں کھو دے یا اس سے روحانی قوت مستعار لیکر مصنوعی تقویت حاصل کر لے بلکہ یہ ہیں کہ وہ اس برتر شخصیت سے تکمیل خودی کا راز سیکھے اور خود اپنی قوتوں کو نشو و نما دے کر اپنی شخصیت یا خودی کو استوار کرے ؎

نقطۂ نوری کہ نام او خودی است   زیر خاک ما شرار زندگی است
از محبت می شود پائندہ تر   زندہ تر سوزندہ تر تابندہ تر
کیمیا پیدا کن از مشت گلے   بوسہ زن بر آستان کاملے
کیفیت ہا خیزد از صہبائے عشق   ہست ہم تقلید از اسمائے عشق
عاشقی محکم شو از تقلید یار   تا کمند تو شود یزداں شکار

خام کاروں کو عشق خود فراموشی اور از خود رفتگی سکھاتا ہے مگر پختہ کاروں کو خود شناسی اور خودداری کا سبق دیتا ہے ؎

بہر دل عشق رنگ تازہ بر کرد   گہے با سنگ و گہ با شیشہ سر کرد
ترا از خود ربود و چشم تر داد   مرا با خویشتن نزدیک تر کرد

ایک لافانی نصب العین کی محبت فانی انسان کی خودی کی تکمیل کر کے

اسے بھی لازوال بنا دیتی ہے ؎

مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ — عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام
تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو — عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام
عشق کی تقویم میں عصر رواں کے سوا — اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام

طلب ہدایت کے لئے کسی مرد کامل کے آگے سر نیاز جھکانا تو خودی کو مستحکم کرتا ہے لیکن مال و دولت، جاہ و منصب کے لئے ارباب اقتدار کا دست نگر ہونا اسے ضعیف کر دیتا ہے۔ فقر و استغنا خودی کی سب سے اہم شرط ہے ؎

اے فراہم کردہ از شیراں خراج — گشتہ روبہ مزاج از احتیاج
از سوال افلاس گردد خوار تر — از گدائی گدیہ گر نادار تر
از سوال آشفتہ اجزائے خودی — بے تجلی نخل سینائے خودی
وائے بر منت پذیر خوان غیر — گردنش خم گشتہ احسان غیر
اے خنک آں تشنہ کاندر آفتاب — می نخواہد از خضر یک جام آب
چوں حباب از غیرت مردانہ باش — ہم بہ بحر اندر نگوں پیمانہ باش

سوال اور گدائی صرف اسی کا نام نہیں کہ مفلس، دولت مند کا طفیلی بن جائے۔ بلکہ دولت جمع کرنے کا ہر طریقہ جس میں انسان خود محنت کر کے

نہ کمائے بلکہ دوسروں کی محنت سے فائدہ اٹھائے، اقبال کے نزدیک گداگری میں داخل ہے۔ یہاں تک کہ وہ بادشاہ بھی جو غریبوں کی کمائی پر بسر کرتا ہے سوال اور دریوزہ گری کا مجرم ہے ؎

میکدے میں ایک دن اک رندِ زیرک نے کہا — ہے ہمارے شہر کا سلطاں گدائے بے نوا
تاج پہنایا ہے کس کی بے کلاہی نے اسے — کس کی عریانی نے بخشی ہے اسے زریں قبا
اس کے آبِ لالہ گوں کی خونِ دہقاں سے کشید — تیرے میرے کھیت کی مٹی ہے اس کی کیمیا
اس کے نعمت خانے کی ہر چیز ہے مانگی ہوئی — دینے والا کون ہے مردِ غریب و بے نوا
مانگنے والا گدا ہے صدقہ مانگے یا خراج
کوئی مانے یا نہ مانے میر و سلطاں سب گدا

گدائی اور فقر میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ گدائی اہلِ دنیا کی احتیاج اور دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانا ہے۔ فقر مادی لذتوں سے بے نیاز ہو کر کائنات کی قوتوں کو تسخیر کرنا، نوامیس فطرت پر حکمرانی کرنا، دنیا میں امن و انصاف کا ڈنکا بجانا، مظلوموں کو ظالموں کے پنجے سے نجات دلانا ہے ؎

چیست فقر اے بندگانِ آب و گل — یک نگاہِ راہ بیں یک زندہ دل
فقر خیبر گیر با نانِ شعیر — بستۂ فتراکِ او سلطان و میر
فقر بر کروبیاں شبخوں زند — بر نوامیس جہاں شبخوں زند

با سلاطین برفتد مردِ فقیر　　از شکوہِ بوریا لرزد سریر

از جنوں می افگند ہوئے بہ شہر　　وا رہاند خلق را از جبر و قہر

نیفتد ملتے اندر نبرد　　تا درو باقی است یک درویش مرد

آبروئے ما ز استغنائے اوست　　سوزِ ما از شوقِ بے پروائے اوست

اک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری　　اک فقر سے کھلتے ہیں اسرارِ جہانگیری

اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری　　اک فقر سے مٹی میں خاصیتِ اکسیری

فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ　　فقر ہے میروں کا میر فقر ہے شاہوں کا شاہ

چڑھتی ہے جب فقر کی سان پہ تیغِ خودی　　ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کارِ سپاہ

کمال ترک نہیں آب و گل سے مہجوری　　کمالِ ترک ہے تسخیرِ خاکی و نوری

میں ایسے فقر سے اے اہلِ حلقہ باز آیا　　تمہارا فقر ہے بے دولتی و رنجوری

جب خودی عشق و محبت اور فقر و استغنا سے مستحکم ہو جاتی ہے تو کائنات کی ساری قوتیں انسان کے قبضہ میں آجاتی ہیں۔

از محبت چوں خودی محکم شود　　قوتش فرماں دہِ عالم شود

پنجۂ او پنجۂ حق می شود — ماہ از انگشتِ او شق می شود

قلندراں کہ بہ تسخیرِ آب و گِل کوشند — ز شاہ باج ستانند و خرقہ می پوشند
بہ جلوت اند و کمند ے بہ مہر و مہ پیچند — بہ خلوت اند و زمان و مکاں در آغوش اند

مگر خودی کی غیر محدود قوت تعمیر و تخریب دونوں کا کام کر سکتی ہے۔ خودی سے تعمیر کا کام لینے کے لئے توسیع کے ساتھ ساتھ اس کی تادیب و تربیت بھی ضروری ہے۔ بے قید اور بے تربیت خودی کی مثال شیطان ہے جس کے متعلق اقبال کا نظریہ نہایت دلچسپ ہے۔ وہ بھی گوئٹے کی طرح اسے بدی کی قوت نہیں بلکہ خودی اور تخلیق کی عظیم الشان قوت سمجھتے ہیں جو محبت و اطاعت کی راہ مستقیم سے بھٹک گئی ہے، خودی کی تادیب و تہذیب کا پہلا درجہ اطاعت ہے یعنی اس قانونِ حیات کی پابندی جو خالقِ عالم نے ہر مخلوق کے لئے مقرر کیا ہے ؎

ہر کہ تسخیرِ مہ و پرویں کند — خویش را زنجیریِ آئیں کند
باد را زنداں گل خوشبو کند — قید بو را نافۂ آہو کند
می زند اختر سوئے منزل قدم — پیشِ آئینے سرِ تسلیم خم
سبزہ بر دینِ نمو روئیدہ است — پائمال از ترکِ آں گردیدہ است
لالہ پیہم سوختن قانونِ او — رقص پیرا در رگِ او خونِ او

قطرہ ہا دریاست از آئینِ وصل | ذرہ ہا صحراست از آئینِ وصل
باطنِ ہر شے ز آئینے قوی | تو چرا غافل ازیں ساماں روی
باز اے آزادِ دستورِ قدیم | زینتِ پا کن ہماں زنجیرِ سیم
شکوہ سنجِ سختیِ آئیں مشو | از حدودِ مصطفیٰ بیروں مرو

دوسرا درجہ ضبطِ نفس ہے یعنی انسان اپنے نفس کی ادنےٰ قوتوں کو جن کی سرکشی کی کوئی حد نہیں ہے قابو میں لاتے خصوصاً نفسانی محبت اور خوف کے جذبات پر جو سب سے زیادہ قوی ہیں غالب آئے ؎

نفسِ تو مثلِ شتر خود پرور است | خود پرست و خود سوار و خود سر است
مرد شو آور زمامِ او بہ کف | تا شوی گوہر اگر باشی خزف
طرحِ تعمیرِ تو از گِل ریختند | با محبت خوف را آمیختند
خوفِ دنیا خوفِ عقبیٰ خوفِ جاں | خوفِ آلامِ زمین و آسماں
حبِ مال و دولت و حبِ وطن | حبِ خویش و اقربا و حبِ زن
تا عصائے لا الٰہ داری بدست | ہر طلسمِ خوف را خواہی شکست
ہر کہ در اقلیمِ لا آباد شد | فارغ از بندِ زن و اولاد شد

ان دونوں مدارج سے گزرنے کے بعد انسان اس درجے پر فائز ہوگا جسے

انسانیت کا اوجِ کمال سمجھنا چاہیئے۔ یہ نیابت الٰہی کا درجہ ہے اور اسے حاصل کرنا ارتقائے خودی کا بلند ترین نصب العین ہے۔ اسی کی تلاش میں نوعِ انسانی ہزارہا سال سے سرگرمِ سعی ہے اور اسی کے انتظار میں کائنات روزِ ازل سے بے قرار ہے ؎

نائب حق در جہاں بودن خوش است — بر عناصر حکمراں بودن خوش است
نائب حق ہمچو جانِ عالم است — ہستیِ او ظلِ اسمِ اعظم است
از رموزِ جزو و کل آگہ بود — در جہاں قائم بامر اللہ بود

اے سوار اشہب دوراں بیا — اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا
رونقِ ہنگامۂ ایجاد شو — در سوادِ دیدۂ ہا آباد شو
نوعِ انساں مزرع و تو حاصلی — کاروانِ زندگی را منزلی
سجدہ ہائے طفلکت بر ناقہ پیر — از جبینِ سرمسارِ ما بگیر

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات — ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز

اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل   اس کی ادا دلفریب اس کی نگہ دلنواز

نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو   رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

نقطۂ پرکار حق مرد خدا کا یقین   ورنہ یہ عالم تمام وہم طلسم و مجاز

عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ   حلقۂ آفاق میں گرمئ محفل ہے وہ

ہم نے اوپر اس ماورق انسانی قانون کا ذکر کیا ہے جس کی پابندی خودی کی تکمیل کے لئے لازمی ہے۔ یہ فرد اور ملت کے ربط کا قانون ہے جسے اقبال "بے خودی" کہتے ہیں۔

ایران اور ہندوستان کے شعرا نفس انسانی کو قطرے سے اور ذاتِ ایزدی کو دریا سے تشبیہ دیتے آئے ہیں۔ اقبال قطرہ و دریا کی تمثیل سے فرد و ملت کے تعلق کو ظاہر کرتے ہیں لیکن ان کے نزدیک قطرے کے دریا میں مل جانے سے اس کی ہستی فنا نہیں ہو جاتی۔ بلکہ اور استحکام حاصل کر لیتی ہے۔ وہ بلند اور دائمی مقاصد سے آشنا ہو جاتا ہے اس کی قوتیں منظم اور منضبط ہو جاتی ہیں اور اس کی خودی پائندہ اور لازوال بن جاتی ہے ؎

فرد تا اندر جماعت گم شود   قطرۂ وسعت طلب قلزم شود

فردِ تنہا از مقاصد غافل است   قوتش آشفتگی را مائل است

قوم با ضبط آشنا گرداندش   نرم رو مثل صبا گرداندش

چوں اسیر حلقۂ آئین شود   آہوئے رم خوئے او مشکیں شود

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں   موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

اب تک ہم نے اقبال کے کلام سے تصورِ خودی کے وہ عناصر منتخب کر کے آپ کے سامنے پیش کئے ہیں جو عالمگیر ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اقبال کا سارا فلسفہ اسلامیت کی روح سے لبریز ہے اور ان کے صحیح مخاطب مسلمان ہیں لیکن ایک سچے شاعر کی طرح ان کے دل میں سارے جہاں کا درد ہے ان کی محبت کل نوعِ بشر کو محیط ہے۔ اور ان کا پیام ایک حد تک سب انسانوں کے لئے عام ہے۔ وہ ہر مذہب و ملت کے لوگوں کو اپنی خودی کی تربیت اور اپنی مخصوص ملی روایات کی حفاظت کی تعلیم دیتے ہیں تاکہ وہ زندگی کے صحیح نصب العین سے قریب تر پہنچ جائیں ؎

من نگویم از بتاں بیزار شو   کافرے شائستۂ زنار شو

اے امانت دارِ تہذیبِ کہن   پشت پا بر ملتِ آبا مزن

گر ز جمعیت حیاتِ ملت است   کفر ہم سرمایۂ جمعیت است

تو کہ ہم در کافری کامل نۂ   لائقِ طوفِ حریمِ دل نۂ

ماندہ ایم از جادۂ تسلیم دور   تو ز آذر من ز ابراہیم دور

قیس ما سودائی محمل نہ شد در جنون عاشقی کامل نہ شد

ان کے کلام سے بے شمار اشعار پیش کئے جا سکتے ہیں جن میں انہوں نے بلا امتیاز مذہب ملت کل نوع انسانی سے خطاب کیا ہے۔ لیکن ہمارے اس دعوے کا کہ اقبال کے فلسفۂ خودی کا جاں بخش پیام صرف مسلمانوں تک محدود نہیں بلکہ مشرق و مغرب کے کل انسانوں کے لئے ہے، قطعی ثبوت "پیام مشرق" کے دیباچے سے ملتا ہے جس کے چند جملے ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔

"حقیقت یہ ہے کہ اقوام عالم کا باطنی اضطراب جس کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہم اس وقت اس وجہ سے نہیں لگا سکتے کہ خود اس اضطراب سے متاثر ہیں ایک بہت بڑے روحانی اور تمدنی اضطراب کا پیش خیمہ ہے یورپ کی جنگ عظیم ایک قیامت تھی جس نے پرانی دنیا کے نظام کو تقریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا ہے اور اب تہذیب و تمدن کی خاکستر سے فطرت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لئے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے ..... مشرق اور بالخصوص اسلامی مشرق نے صدیوں کی نیند کے بعد آنکھ کھولی ہے مگر اقوام مشرق کو یہ محسوس کر لینا چاہیئے کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب نہیں پیدا کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ فطرت کا یہ اٹل قانون جس کو قرآن نے

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِأَنْفُسِهِمْ کے سادہ اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے، زندگی کے فردی اور اجتماعی پہلو پر حاوی ہے اور میں نے اپنے فارسی کلام میں اسی صداقت کو مدنظر رکھنے کی کوشش کی ہے اس وقت دنیا میں اور بالخصوص ممالک مشرق میں ہر ایسی کوشش جس کا مقصد افراد و اقوام کی نگاہ کو جغرافی حدود سے بالاتر کر کے ان میں ایک صحیح اور قوی انسانی سیرت کی تجدید یا تولید ہو، قابل احترام ہے۔"

آپ نے دیکھا کہ اقبال کا نصب العین افراد اور اقوام کی نگاہ کو جغرافی حدود سے بالاتر کر کے ایک صحیح اور قوی انسانی سیرت کی تجدید و تولید" ہے اسی کو انہوں نے اپنی تصانیف میں مدنظر رکھا ہے اور اسی کا پیام مغرب و مشرق کو دینا چاہتے ہیں۔

ہم اوپر کہہ چکے ہیں کہ خالص فلسفیانہ نظریے کی حیثیت سے انسانیت کا ایک عالمگیر تصور ممکن ہے لیکن جب اس تصور کو ایک زندہ نصب العین کی صورت میں پیش کرنا ہو تو وسیع سے وسیع نظر رکھنے والا بھی اس پر مجبور ہے کہ انسانیت کی تصویر کسی خاص ملت کے آئینے میں دیکھے۔ اقبال کے لئے ملت بیضائے اسلام اس آئینے کا کام دیتی ہے۔ ان کے نزدیک انسان کی خودی کی حقیقی تکمیل اور فرد و ملت کا حقیقی ربط صرف اسلام ہی کے ذریعے

سے ممکن ہے۔ اس لئے کہ اسلام میں فرد اور ملت کا رشتہ اتحاد، نسل یا وطن کا محدود تصور نہیں بلکہ توحید اور رسالت کا وسیع اور ہمہ گیر عقیدہ ہے۔

با وطن وابستہ تقدیر امم — بر نسب بنیاد تعمیر امم
اصل ملت در وطن دیدن کہ چہ — با دو آب و گل پرستیدن کہ چہ
ملت ما را اساس دیگر است — این اساس اندر دل ما مضمر است
مدعائے ما مآل ما یکیست — طرز و انداز خیال ما یکیست
لا الہ سرمایۂ اسرار ما — رشتہ اش شیرازۂ افکار ما
ملت بیضا تن و جاں لا الہ — ساز ما را پردہ گرداں لا الہ

از رسالت در جہاں تکوین ما — از رسالت دین ما آئین ما
از رسالت صد ہزار ما یک است — جزو ما از جزو ما لاینفک است
از میان بحر او خیزیم ما — مثل موج از ہم نمی ریزیم ما
دین فطرت از نبی آموختیم — در رہ حق مشعلے افروختیم
این گہر از بحر بے پایاں اوست — این کہ یک جائیم از احسان اوست
قوم را سرمایۂ قوت ازو — حفظ سر وحدت ملت ازو

فرد کو حقیقی آزادی ملت اسلامی ہی کے اندر حاصل ہوئی کیونکہ اُسی

نے نوع انسانی کو حقیقی معنی میں حریت، مساوات اور اخوت کا نمونہ دکھایا۔ توحید کے عقیدے نے نسل و نسب کے امتیاز کو مٹا دیا۔ غریبوں کو امیروں کے اور زیر دستوں کو زبردستوں کے تسلط سے آزاد کر کے عدل و انصاف کی حکومت قائم کی اور اسلام کے رشتے سے انسانوں کو ایک دوسرے کا بھائی بنا دیا۔

اے تہی از ماسوا بیگانۂ — بر چراغِ مصطفےٰ پروانۂ
ناشکیب امتیازات آمدہ — در نہادِ او مساوات آمدہ
پیش قرآں بندہ و مولا یکے است — بوریا و مسند و دیبا یکے است

عشق را آرام جاں حریت است — ناقہ اش را ساربان حریت است
موسیٰ و فرعون و شبیر و یزید — ایں دو قوت از حیات آمد پدید
زندہ حق از قوت شبیری است — باطل آخر داغ حسرت میری است
ماسوی اللہ را مسلماں بندہ نیست — پیش فرعونے سرش افگندہ نیست
کل مومن اخوۃ اندر دلش — حریت سرمایۂ آب و گلش

تکمیل خودی کی ایک اہم شرط یہ بھی ہے کہ نفس زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہو جائے اور یہ بات بھی ملت اسلامی کے اندر حاصل ہو سکتی ہے جو خود

حدودِ زمانی و مکانی سے بالاتر ہے۔ اس لئے کہ اس کا اساس نسل و وطن کا مادی تخیل نہیں بلکہ توحید و رسالت کا روحانی عقیدہ ہے۔ نسل فنا ہو سکتی ہے، وطن کا رشتہ ٹوٹ سکتا ہے مگر کلمۂ توحید کا رشتہ لافانی اور لازوال ہے۔

جوہرِ ما با مقامے بستہ نیست — بادۂ تندش بہ جامے بستہ نیست
عقدۂ قومیتِ مسلم کشود — از وطن آقائے ما ہجرت نمود
حکمتش یک ملتِ گیتی نورد — بر اساسِ کلمۂ تعمیر کرد
ہر کہ از قیدِ جہات آزاد شد — چوں فلک در شش جہت آباد شد

امتِ مسلم ز آیاتِ خدا است — اصلش از ہنگامۂ قالوا بلیٰ است
تا خدا اَن یطفئوا فرمودہ است — از فسردن ایں چراغ آسودہ است
رومیاں را گرم بازاری نماند — آں جہانگیری جہانداری نماند
شیشۂ ساسانیاں در خوں نشست — رونقِ خمخانۂ یوناں شکست
مصر ہم در امتحاں ناکام شد — استخوانِ او تہِ اہرام شد
در جہاں بانگِ اذاں بودست و ہست — ملتِ اسلامیاں بودست و ہست

ملتِ اسلامی کے لئے قرآنِ کریم آئینِ حیات کا اور اخلاقِ محمدی اُسوۂ

زندگی کا کام دیتا ہے۔ آئین الٰہی پر عمل کرنے سے اس کی سیرت میں پختگی اور آداب محمدی کی پیروی سے حسن اور دلکشی پیدا ہوتی ہے۔ اس کا مرکز مشہود کعبہ اور اس کا نصب العین حفظ و نشر توحید ہے

تو ہمی دانی کہ آئین تو چیست	زیر گردوں سرّ تمکین تو چیست
آن کتاب زندہ قرآن حکیم	حکمت او لایزال است و قدیم
نسخۂ اسرار تکوین حیات	بے ثبات از قوتش گیرد ثبات
از یک آئینی مسلمان زندہ است	پیکر ملت ز قرآں زندہ است

ملت از آئین حق گیرد نظام	از نظامے محکمے گیرد دوام
ہست دین مصطفیٰ دین حیات	بے ثبات از قوتش گیرد ثبات

غنچۂ از شاخسار مصطفیٰ	گل شو از باد بہار مصطفیٰ
از بہارش رنگ و بو باید گرفت	بہرۂ از خلق او باید گرفت
فطرت مسلم سراپا شفقت است	در جہاں دست و زبانش رحمت است

قوم را ربط و نظام از مرکزے	روزگارش را دوام از مرکزے
راز دار و راز ما بیت الحرام	سوز ما ہم ساز ما بیت الحرام

تو ز پیوندِ حریمے زندۂ — تا طوافِ او کنی پایندۂ
در جہاں جانِ امم جمعیت است — در نگر سرِ حرم جمعیت است

زانکہ در تکبیر رازِ بودِ تست — حفظ و نشرِ لا الٰہ مقصودِ تست
تا نہ خیزد بانگِ حق از عالمے — گر مسلمانی نیاسائی دمے
آب و تابِ چہرۂ ایامِ تو — در جہاں شاہد علی الاقوامِ تو
نکتہ سنجان را صلائے عام دہ — از علومِ امّیٔ پیغام دہ
تا بدست آورد نبضِ کائنات — وا نمود اسرارِ تقویمِ حیات
در جہاں وابستۂ دینش حیات — نیست ممکن جز بہ آئینش حیات

یہ یک آئینی اور یک جہتی، ہم مرکزی اور ہم مقصدی ملت کو متحد کر کے ایک نفسِ واحد بنا دیتی ہے اور اس میں ایک اجتماعی خودی کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ جس کی مجموعی قوت فرد کی خودی کو تقویت پہنچاتی ہے اور وسیع تر اور مستحکم تر بناتی ہے۔ ملت کا احساسِ خودی بھی فرد کے احساسِ خودی کی طرح اسی سے توسیع اور استحکام حاصل کرتا ہے۔ کہ کارزارِ حیات میں عالمِ خارجی کی قوتوں کا مقابلہ کرے، علم کے ذریعے سے ان کی حقیقت کو پہچانے اور عمل کے ذریعے انہیں تسخیر کرے۔ عالمِ اسباب کو حقیر جان کر ترک کر دینا غفلت کی

انتہا ہے۔ یہ فرد اور ملت کا میدان عمل اور ان کی عقل اور ارادے کی تربیت گاہ ہے۔ اگر انسان علم کی مدد سے اپنے خارجی ماحول پر غالب نہ آئے تو اس سے مغلوب ہو کر ہلاک ہو جائے گا۔ اس لئے علم اشیاء بھی معرفت نفس کی طرح خودی کے نشوونما کے لئے ناگزیر ہے۔

ہر کہ محسوسات را تسخیر کرد — عالمے از ذرہ تعمیر کرد
کوہ و صحرا و دشت و دریا بحر و بر — تختۂ تعلیم ارباب نظر
اے کہ از تاثیر افیوں خفتۂ — عالم اسباب را دوں گفتۂ
خیز و واکن دیدۂ مخمور را — دوں مخواں ایں عالم مجبور را
غایتش توسیع ذات مسلم است — امتحان ممکنات مسلم است
کاروانِ بگذشتست ایں جہاں — نقد مومن را عیار است ایں جہاں
گیر او را تا نہ او گیرد ترا — ہمچو مے اندر سبو گیرد ترا

جستجو را محکم از تدبیر کن — نفس و آفاق را تسخیر کن
چشم خود بکشا و در اشیا نگر — نشہ زیر پردۂ صہبا نگر
تا قوی از حکمت اشیا شوی — ناتواں باج از توانایاں خورد
علم اشیا اعتبار آدم است — حکمت اشیا حصار آدم است

ملت کے احساس خودی کی توسیع کے لئے علم کائنات اور تسخیر کائنات کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی تاریخ اور اپنی روایات کی یاد کو دل میں تازہ رکھے۔ تاریخ' اقوام کی زندگی کے لئے قوت حافظہ کا حکم رکھتی ہے حافظہ ہی وہ چیز ہے جس سے فرد کے مختلف ادراکات میں ربط اور تسلسل پیدا ہوتا ہے۔ جب خارجی حیات کے ہجوم میں اسے "میں" یا "انا" کا مرکز ہاتھ آتا ہے تو یہی حافظہ اس احساس خودی کی حفاظت کرتا ہے۔ بالکل اسی طرح تاریخ سے ملت کی زندگی کے مختلف ادوار میں ربط اور تسلسل پیدا ہوتا ہے اور یہی شیرازہ بندی اس کے شعور خودی کی تکمیل اور اس کے بقائے دوام کی ضامن ہے وہی قومیں دنیا میں زندہ رہتی ہیں جو اپنے حال کا رشتہ ایک طرف ماضی سے اور دوسری طرف مستقبل سے استوار کرتی ہیں' زندگی نام ہی اس احساس تسلسل کا ہے۔

کودکے را دیدی اے بالغ نظر — کو بود از معنی خود بے خبر
نقش گیر این و آں اندیشہ اش — غیر جوئی غیر بینی پیشہ اش
تا ز آتش گیری افکار او — گل فشاند زرچک پندار او
چشم گیر آتش فتد بر خویشتن — دستکے بر سینہ می گوید کہ "من"
یاد او با خود شناسائش کند — حفظ ربط دوش و فرداش کند

این "من" نوزاده آغاز حیات ‏ ‏ ‏ ‏ نغمهٔ بیداری ساز حیات

ملت نوزاده مثل طفلک است ‏ ‏ ‏ ‏ طفلکے کو در کنار مادر است
بسته با امروز او فردا ش نیست ‏ ‏ ‏ ‏ حلقه‌ہائے روز و شب در پاش نیست
چشم هستی را مثال مردم است ‏ ‏ ‏ ‏ سینه را بیننده و از خود گم است
صد گره از رشتهٔ او وا کند ‏ ‏ ‏ ‏ تا سر تار خودی پیدا کند
گرم چوں افتد بکار روزگار ‏ ‏ ‏ ‏ این شعور تازه گردد پائیدار
نقش‌ها بر دارد و اندازد او ‏ ‏ ‏ ‏ سرگذشت خویش را می سازد او
قوم روشن از سواد سرگذشت ‏ ‏ ‏ ‏ خود شناس آمد ز یاد سرگذشت
نسخهٔ بود ترا اے ہوشمند ‏ ‏ ‏ ‏ ربط ایام آمده شیرازه بند
ضبط کن تاریخ را پاینده شو ‏ ‏ ‏ ‏ از نفس‌ہائے رمیده زنده شو
سر زند از ماضی تو حال تو ‏ ‏ ‏ ‏ خیزد از حال تو استقبال تو
مشکن از خواہی حیات لازوال ‏ ‏ ‏ ‏ رشتهٔ ماضی ز استقبال و حال
موج ادراک تسلسل زندگی است ‏ ‏ ‏ ‏ مے کشاں را شور قلقل زندگی است

اوپر کے صفحات میں اقبال کے تصورِ خودی کے دو پہلو آپ کے سامنے آ گئے۔ ایک یہ کہ خودی کا غیر خود یعنی عالم خارجی سے، دوسرے یہ کہ

اس کا نفس اجتماعی یعنی ملت سے کیا تعلق ہونا چاہیئے۔ ابھی ایک تیسرا پہلو باقی ہے جو ان دونوں سے زیادہ نازک اور لطیف ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ فرد کا بہ حیثیت مخلوق کے اپنے خالق سے صحیح علاقہ کیا ہے؟ آپ نے دیکھا کہ خودی غیر خود سے ٹکرا کر اور اسکی قوتوں کو تسخیر کر کے استحکام اور توسیع حاصل کرتی ہے اپنی فطرت کے قانون کی پابندی سے یعنی توحید و رسالت کے روحانی عقیدے کی بنا پر ملت کے حبل متین مربوط ہو جانے سے پائدار اور لازوال بن جاتی ہے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ یہ محدود لازوال ہستی اس ذات لایزال سے جس نے اس کو اور کل کائنات کو پیدا کیا کیا رشتہ رکھتی ہے

اب تک اقبال کے کلام کا موضوع فلسفۂ نفس اور فلسفۂ تمدن کے مسائل تھے جن میں جذبات کو بہت کم دخل ہے۔ جذبات شاعری کی جان ہیں اور خشک فلسفیانہ مسائل جو جذبات کے کیف و رنگ سے خالی ہوں شعریت پیدا کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ یہ اقبال کا کمال فن ہے کہ انہوں نے حکمت کو اپنے سوز دل کی حرارت سے شعر بنا دیا۔ یہ ان کے حصے کی چیز ہے جس میں ایشیا کے قدیم و جدید شاعروں میں بہت کم ان کے ساتھ شریک ہیں لیکن اب وہ تصوف کے میدان میں قدم رکھتے ہیں، جہاں واردات قلب کو ناتمام تصورات کا ایک ہلکا سا لباس پہنا کر الفاظ میں ادا کرنا ہے، ایک

لحاظ سے یہ مرحلہ الشیبائی شاعر کیلئے سب سے زیادہ آسان ہے۔ اس لئے کہ یہ احساسات اسکی طبیعت میں رچے ہوئے ہیں اور پھر ان میں کچھ اس درجہ شعریت ہے کہ خود بخود شعر کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں مگر دوسرے لحاظ سے دیکھئے تو یہ میدان اس قدر پامال ہو چکا ہے کہ اس میں کوئی نئی راہ نکالنا نہایت مشکل ہے لیکن اقبال کا طرز خیال ہی سب سے جدا ہے اس لئے ان کے تصوف نے خود بخود اپنے لئے ایک نیا راستہ پیدا کر لیا ہے وہ اسی منزل کیطرف لیجاتا ہے جو ان کے فلسفہ حیات کی منزل ہے یہی وہ نازک مقام ہے جس میں روحانیت کا ذوق رکھنے والی طبیعتیں آکر الجھ جاتی ہیں بادۂ معرفت کے پہلے ہی جام میں علم کائنات اور احساس خودی کا رشتہ ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ یہ اقبال ہی کا ظرف ہے کہ عالم بے خودی میں بھی نہیں اتنا ہوش رہتا ہے کہ اس امانت کو نہیں بھولتے جو خدا نے انسان کے سپرد کی ہے۔

ہم نے اوپر کہا تھا کہ طالب خودی اس مردِ خدا" کی محبت میں جو مدارج خودی میں اس سے برتر ہے سرشار ہو جاتا ہے پھر کیا ٹھکانا ہے اس کیف و مستی کا جو خودی کے مبدأ و منتہا اور خالق و پروردگار یعنی خدائے تعالیٰ کی محبت اسکے دل میں پیدا کر دیتی ہے انسان اپنے دائرہ ارتقاء میں خودی کے مراحل طے کرنے کے بعد بھی ناقص و ناتمام ہی رہتا ہے اور کمال و تمام کا وہ جلوہ جو اسے ذاتِ مطلق میں نظر آتا ہے اس کے دل کو بے ساختہ اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اسی کشش کا

نام عشق حقیقی ہے۔ عشق کی تین منزلیں ہوتی ہیں۔ آرزو، جستجو، اور دیدار یا وصل
قدیم صوفی شعرا کے یہاں اس تیسری منزل کا تصور یہ ہے کہ طالب مطلوب
کے اندر اس طرح فنا ہو جائے جیسے قطرہ دریا میں محو ہو جاتا ہے اور ظاہر
ہے کہ محدود نامحدود کے وصل کا اس کے سوا کوئی تصور ہی نہیں ہو سکتا۔
مگر اقبال کے نزدیک اس عشق کی صرف دو ہی منزلیں ہیں۔ پہلی منزل
سوز و گداز آرزو کی ہے۔ دوسری کیف دیدار کی جو راحت بخش بھی ہے اور
اضطراب افزا بھی۔ تیسری کوئی منزل نہیں۔ لذتِ دیدار سے کامیاب ہونے
کے بعد بھی نفس انسانی روحِ مطلق سے جدا رہتا ہے اور درد جدائی سے
تڑپتا ہے۔ یہی اس کی فطرت ہے اور یہی اس کی تقدیر۔

اب اس اجمال کی تفصیل اقبال کے کلام میں ملاحظہ ہو۔ صوفی شعرا کے
نزدیک عالمِ شہود کی تخلیق کی غایت یہ ہے شاہدِ مطلق اس آئینے میں اپنے جمال
کا نظارہ کرے۔

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں
(غالب)

اقبال کا بھی یہی خیال ہے۔

صورت گرے کہ پیکرِ روز و شب آفرید از نقشِ این آن بہ تماشائے خود رسید

فرق یہ ہے کہ اوروں کے نزدیک ماسوا محض موہوم ہے اور اقبال کے

نزدیک موجود. غالب کہتے ہیں.

شاہدِ ہستیٔ مطلق کی کمر ہے عالم   لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

مگر جیسا کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں کہ اقبال کے خیال میں کائنات کے اندر حیاتِ حقیقی یعنی خودی کی قوت مضمر ہے اور اس اعتبار سے مظاہرِ کائنات محض وہم ہی وہم نہیں ہیں بلکہ کم سے کم بالقوۃ وجود رکھتے ہیں جب یہ قوت رفتہ رفتہ ارتقاء پاکر انسان کی ذات میں شعور اور ارادہ حاصل کر لیتی ہے تو اس کا وجود نمایاں ہو جاتا ہے۔ میلادِ آدم دنیا میں ایک نئے دورِ حیات کا آغاز ہے۔ اس لئے کہ وہ اپنی نیستی کا شعور اور ہستیٔ مطلق کی معرفت کا حوصلہ رکھتا ہے۔

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد   حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور   خودگرے خودشکنے خودنگرے پیدا شد
خبرے رفت ز گردوں بہ شبستانِ ازل   حذر اے پردگیاں پردہ درے پیدا شد
آرزو بے خبر از خویش بہ آغوشِ حیات   چشم وا کرد و جہانِ دگرے پیدا شد

یہ نیا مخلوق سوز و سازِ آرزو سے معمور ہے۔ اس کے دل میں ابتدا سے نہ صرف اپنی محدود حقیقت بلکہ ذاتِ ایزدی کی نامحدود حقیقت کا محرم بننے کی لگن ہے۔ وہ زبانِ حال سے کہتا ہے۔

چه خوش است زندگی را همه سوز و ساز کردن — دل و کوه و دشت و صحرا به دمی گداز کردن
به گداز های پنهان به نیاز های پیدا — نظرے ادا شناسے به حریم ناز کردن
گهے جز یکے ندیدن به هجوم لاله زارے — گهے خار نیش زن را ز گل امتیاز کردن
همه سوز ناتمامم همه درد آرزویم — به گمان دهم یقین را که شهید جستجویم

پہلے اس کی آرزو صرف یہیں تک محدود رہتی ہے کہ ماسوا کے پردے سامنے سے ہٹ جائیں اور شاہد مطلق کا جمال بے حجاب نظر آئے۔

چند بروئے خود کشی جلوۂ صبح و شام را — چہرہ کشا تمام کن جلوۂ ناتمام را

بر سر کفر و دیں فشاں رحمت عام خویش را — بند نقاب بر کشا ماہ تمام خویش را

اگر وہ طاقت دیدار رکھتا ہے تو یہ آرزو پوری ہو سکتی ہے۔ مگر صرف اس حد تک کہ کبھی کبھی حسن مطلق کی ایک جھلک نظر آتی ہے اور آناً فاناً چھپ جاتی ہے۔

زیں عالم حجاب ما ورنہ آں عالم نقاب او را — اگر تاب نظر داری نگاہے می تواں کردن

افلاک سے آتے ہیں نالوں کے جواب آخر — کرتے ہیں خطاب آخر اٹھتے ہیں حجاب آخر

تو زراہِ دیدۂ ما بہ ضمیر ما گزشتی مگر آں چناں گزشتی کہ نگہ خبر نہ دارد

مگر اس سے طالبِ دیدار کی تسکین نہیں ہوتی بلکہ اس کا اضطراب قلب اور بڑھ جاتا ہے اور اس کشمکش سے عاجز آکر وہ چاہتا ہے کہ بجرِ وجود اپنی کشش کو بڑھا دے اور اس کے قطرۂ خودی کو اپنے آغوش میں لے کر سکونِ دائمی بخشے۔

فرصتِ کشمکش مدہ ایں دلِ بے قرار را یک دو شکن زیادہ کن گیسوئے تابدار را

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر ہوش و خرد شکار کر قلب و نظر شکار کر

عشق بھی ہو حجاب میں حسن بھی ہو حجاب میں یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر

تو ہے محیطِ بیکراں میں ہوں ذرا سی آبجو یا مجھے ہمکنار کر یا مجھے بے کنار کر

لیکن اس وصل و دیدار میں یہ اندیشہ ہے کہ کہیں قطرہ دریا میں مل کر اپنی خودی کو فنا نہ کر دے اور یہ بات اقبال کو کسی طرح گوارا نہیں۔

اگر نظارہ از خود رفتگی آرد حجاب اولیٰ
نہ گیرد با من ایں سودا بہا از بس گراں خواہی

اگر یک ذرہ کم گردد ز انگیزِ وجودِ من بہ ایں قیمت نمی گیرم حیاتِ جاودانی را

وہ ایسا وصل نہیں چاہتے جس میں قطرے کا انفرادی وجود مٹ جائے لیکن ان کے خیال میں یہ اندیشہ بے جا ہے۔ دیدار و معرفت الٰہی سے خودی کی آب و تاب کم نہیں ہوتی بلکہ اور بڑھ جاتی ہے۔

کمال زندگی دیدار ذات است   طریقش رستن از بند جہات است
چناں با ذات حق خلوت گزینی   ترا او بیند و او را تو بینی
منور شو ز نور "من یرانی"   مژہ برہم مزن تو خود نہ مانی
بخود محکم گزر اندر حضورش   مشو ناپید اندر بحر نورش
چناں در جلوہ گاہ یار می سوز   عیاں خود را نہاں او را برافروز

اگر قطرے کے دل میں کبھی اپنی کم مائگی کا خطرہ گزرتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ دریا کے آگے اس کی ہستی معدوم محض ہے تو خود بحر حقیقت اس کی خودی کی بقا کی ضمانت کرتا ہے۔

یکے قطرہ باراں ز ابرے چکید   خجل شد چو پہنائے دریا بدید
"کہ جائیکہ دریاست من کیستم   گر او ہست حقا کہ من نیستم"
ولیکن ز دریا بر آمد خروش   ز شرم تنک مائیگی رو مپوش
ز موج سبک سیر من زادۂ   ز من زادۂ در من افتادۂ
بیا سائے در خلوت سینہ ام   چو جوہر درخش اندر آئینہ ام

گہر شود در آغوش قلزم بدی　　فروزاں تر از ماہ و انجم بزی

اسی طرح قطرۂ ناچیز میں جوش عشق وہ ظرف پیدا کر دیتا ہے کہ وہ دریا کو اپنے آغوش میں لینے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔

در سینۂ من دمے بیاسائے　　از زحمت و کلفت خدائی

حفظ خودی کا خیال عشق کے منافی نہیں بلکہ عین عشق ہے۔ حسن کا عیار عاشق کا دل ہے اور بزم حسن کا فروغ عاشق کے دم سے ہے۔ وہ اپنی خودی کی حفاظت اپنے لئے نہیں بلکہ معشوق کی خاطر کرتا ہے۔

خدائے زندہ بے ذوقِ سخن نیست　　تجلّی ہائے او بے انجمن نیست

کہ برق جلوۂ او بر جگر زد　　کہ خود آں بادہ و ساغر بہ سر زد

عیار حسن و خوبی از دلِ کیست　　مہ او در طواف منزلِ کیست

الست از خلوت ناز کہ برخاست　　ملی از پردۂ ساز کہ برخاست؟

اگر مائیم گرداں جام ساقی است　　بہ بزمش گرمی ہنگامہ باقی است

مرا دل سوخت بر تنہائی او　　کنم سامان بزم آرائی او

شمال دانہ می کارم خودی را　　برائے او نگہ دارم خودی را

لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، محدود کا حقیقی وصل نامحدود سے یہی

ہے کہ اس کے اندر محو ہو جائے بندے اور خدا کا یہ وصل جو اقبال کے پیشِ نظر ہے حقیقت میں وصل نہیں ہے۔ یہ ایک خاص حالت ہے جس میں سکون حاصل نہیں ہوتا بلکہ سوز و سازِ فراق اور بڑھ جاتا ہے۔

او در پئے من زمن درومندِ ہجراں کہ وصالست ایں
اے عقل چہ می گوئی اے عشق چہ فرمائی

از وجودِ ما بہ پیدن فطرت ماست
تپیدن نارسیدن فطرت ماست
نہ ما را در فراق او عیارے
نہ او را بے وصالِ ما قرارے
نہ او بے ما نہ ما بے او چہ حال است
فراقِ ما فراق اندر وصال است

کبھی دردِ فراق میں اقبال اپنے آپ کو یہ کہہ کر تسکین دیتے ہیں کہ سوز و گداز کا یہ کیف انسان ہی کا حصّہ ہے۔ خدا اس سے محروم ہے۔

سوز و گداز حالتے است بادہ ز من طلب کنی
پیشِ تو گر بیاں کنم مستیٔ ایں مقام را

متاعِ بے بہا ہے دردِ سوزِ آرزومندی
مقامِ بندگی دیکر نہ لوں شانِ خداوندی
کبھی شوخیٔ تخیل سے یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح بندہ خدا کے ہجر میں بےچین

ہے۔ اسی طرح خدا بھی بندے کے فراق میں بے قرار ہے۔

ما از خدائے گم شدہ ایم او بہ جستجوست
چوں ما نیاز مند و گرفتار آرزوست

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کار جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

بہرحال یہ جدائی انسان کے لئے مبارک ہے کیونکہ یہی اس کی خودی کی وجہ حیات ہے۔

جدائی عشق را آئینہ دار است
جدائی عاشقاں را ساز گار است

اگر ما زندہ ایم از دردمندی است
وگر پائندہ ایم از دردمندی است

عالم سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگ آرزو، ہجر میں لذت طلب

گرمی آرزو فراق، لذت ہائے و ہو فراق
موج کی جستجو فراق، قطرے کی آبرو فراق

یہ ہے ایک مختصر سا خاکہ اس نظریۂ حیات کا جو اقبال نے ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ یہ فلسفی شاعر دنیا میں ایک ایسا دل لے کر آیا جو سوز حیات

اور وجدِ کائنات سے لبریز تھا۔ اور ایک ایسا دماغ جو زندگی کے اسرار و معارف کا محرم تھا۔ اس نے دنیا کو ایسی حالت میں پایا کہ مشرق خصوصاً اسلامی مشرق جو اب تک خوابِ غفلت میں مدہوش تھا کسمسا کر کروٹ بدلنا چاہتا ہے۔ مگر غلامی کا کابوس جو اس کے دل و دماغ پر مسلط ہے اسے ہلنے نہیں دیتا۔ مغرب جس نے اپنی بیدار مغزی سے ربع مسکوں پر اپنا سکہ بٹھا لیا ہے طمع و نخوت کے نشے میں چور، انقلاب کی ان قوتوں سے جو خود اس کے اندر سے ابھر رہی ہیں، ٹکرایا[1] چاہتا ہے۔ اس کا دل کڑھا ایشیا کی بے حسی اور بے بسی پر جو قید مذلت میں گرفتار ہے اور کچھ نہیں کرتا اور یورپ کی ناعاقبت اندیشی پر جو قعر ہلاکت میں گرنے والا ہے اور کچھ نہیں دیکھتا۔ اس نے ایک کی بے علمی اور دوسرے کی بے بصری کے اسباب پر غور کیا اور اس کی حقیقت میں نظر سطحی چیزوں سے گذرتی ہوئی ان تصورات حیات پر جا کر پڑی جن پر ان دونوں تہذیبوں کی بنیادیں قائم ہیں۔ اس نے دیکھا کہ ایشیا کے قوائے ذہنی کو ماؤف اور اس کے دستِ عمل کو شل کرنے والا نفی خودی اور نفی کائنات کا فلسفہ ہے۔ اب رہا یورپ تو اس میں

لہ مضمون اکتوبر ۱۹۳۸ء کا لکھا ہوا ہے۔ یہ حالت اس وقت تھی۔ آج تو یورپ ٹکرا کر پاش پاش بھی ہو گیا۔ د

شک نہیں کہ اس نے اثبات خودی کی اہمیت کو سمجھ کر میدان عمل میں قدم بڑھایا۔ اور فرد و جماعت کے ربط سے اپنی زندگی کو استوار بنایا۔ لیکن چونکہ اس ربط کی بنیاد کسی عالمگیر روحانی عقیدے پر نہیں بلکہ نسل و وطن کے تنگ مادی نظریے پر تھی اس لئے بہت جلد اس کے اندر انتشار کی قوتیں نمودار ہو گئیں۔ صحیح نصب العین اقبال کے نزدیک اسلام کا ہے جس نے ایشیا کی روحانیت اور یورپ کی عملیت کو سمو کر دنیا کو دین فطرت کی راہ دکھائی۔ مگر گردش زمانہ سے اسلام کے پیرو بھی وحدت وجود کے عقیدے کی بدولت جو نفی خودی اور نفی کائنات کی تعلیم دیتا ہے اسی غفلت و جمود کا شکار ہو گئے جو ایشیا کی اور قوموں پر طاری تھا۔ اس کی سزا انہیں یہ ملی کہ یورپ کی ذہنی اور سیاسی غلامی کی زنجیروں میں گرفتار ہو کر ذلت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان حقائق کو سمجھنے اور سمجھانے کے بعد اقبال اپنے جاں بخش اور جاں فزا نغمۂ امید سے ملت اسلامی کو غفلت سے جگاتا ہے تاکہ وہ اس خدمت کو جو خدا نے اس کے سپرد کی ہے پورا کرے اور دنیا کو اس روحانی اور مادی ہلاکت سے جو آج چاروں طرف منڈلا رہی ہے، نجات دے۔ اقبال کی نظر مشرق و مغرب میں ایک زبردست سیاسی اقتصادی انقلاب کے آثار دیکھتی ہے اور اسے صحیح راہ پر لگانے کے لئے وہ پہلے مسلمانوں کے اور

پھر کل اقوام عالم کے قلوب میں ایک روحانی انقلاب پیدا کرنا چاہتا ہے۔ وہ دُنیا سے اٹھ گیا۔ مگر اس کا پیام فضائے عالم میں گونج رہا ہے۔ اور گونجتا رہے گا۔

تمّت

سنہ ۱۹۴۹ء

پیامِ اقبالؒ

از عبدالرحمٰن طارق بی۔اے

"پیامِ اقبال" اردو زبان میں اپنے موضوع پر وہ سب سے پہلی کتاب ہے جو علامہ اقبال کی زندگی ہی میں تیار ہو گئی تھی۔ یہ کتاب جب علامہ مرحوم کے حضور پیش کی گئی تو بعد از مطالعہ ارشاد فرمایا: "اِس میں شک نہیں کہ "پیامِ اقبالؒ"، میرے پیام و کلام کی نہایت حسین و مؤثر ترجمانی ہے اور اس سے میرے بعض اہم زاویہ ہائے فکر، نظر پر بصیرت افروز روشنی پڑتی ہے!"

اِس کتاب میں اٹھارہ پُر مغز اور فاضلانہ مقالات ہیں، جنمیں سے ہر مقالہ حسبِ عنوان علامہ مرحوم کے دقیق فارسی و اُردو کلام کی تشریح بھی کرتا ہے۔ اندازِ بیان نہایت فصیح و دلچسپ، تشریحِ اشعار تسلّی بخش اور زبان عام فہم ہے۔ اب تیسرا ایڈیشن نہایت حسین جمیل صورت میں چھپا ہے۔ اپنی فرمائش جلد روانہ فرمایئے کہ ختم ہونے پر پھر آپ کو زحمت نہ اٹھانی پڑے۔ ضخامت ۲۶۰ صفحات، قیمت مجلد دو روپے بارہ آنے

دفتر اقبال اکیڈمی ایبک روڈ، انارکلی لاہور

کتبہ اقبال عباسی

ترجمانِ حقیقت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال رح کے افکار، عقائد اور پیغام کے واحد مبلغ

ماہ نامہ

پیغامِ حق لاہور

کا مطالعہ کیجیے

جو ملک کے مشہور انشاپردازوں کے زیرِ ادارت ہر ماہ باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے

قیمت سالانہ پانچ روپے نمونے کا پرچہ ۸ آنے

مینجر رسالہ "پیغامِ حق" - ظفر منزل تاجپورہ - لاہور

یا

دفتر اقبال اکیڈیمی

ایبک روڈ، انارکلی لاہور

پر، سرورق رپن پریس، لاہور میں چھپا